SPCRD GLOBAL PUBLISHING

Journal of Languages, Culture and Civilization

Volume 5, Issue 2, June 2023, Pages: 177-186

Homepage: http: jlcc.spcrd.org **ISSN(P):** 2708-3748

Issues of Contemporary Urdu Research and Retrieval of Quality

Muhammad Khawar Nawazish [a]

[a] Associate Professor, Department of Urdu, Bahauddin Zakariya University Multan.

Corresponding author's email: khawarnawazish@bzu.edu.pk

Received: 20 May 2023 **Published:** 30 June 2023

Abstract

Urdu research is facing various problems at present and these problems are actually more in institutional level research. There is a lot of repetition in the topics that students choose for research, mainly because the topics are made up for serving the purpose. The themes and topics of research are not based on any philosophical thought process. This paper tried to highlight these issues. At the same time, students' unfamiliarity with research principles and methods has also been made a topic. In order to retrieve the quality of the research in Urdu, two different articles and examples of their topics, content, methods and discussions are presented, including "Muhammad Hussain Azad as a Researcher" by Qazi Abdul Wudud and "History of Urdu Literature till 1700: In the light of Research" by Abrar Abdul Salam. Writer of this research paper is of the view that at least above mentioned two articles should be taught to the students before they are forced into the field of practical research.

Keywords

Research, Contemporary, Principles, Quality, Problems, Issues.

DOI Number: 10.47067/jlcc.v3i4.181

© 2023 The authors. Published by SPCRD Global publishing. This is an open access article under the Creative Commons Attributions-NonCommercial 4.0

عصری منظرنامے پر اُردو تنقید اور تحقیق سے کہیں زیادہ اُردو تخلیق کی حیثیت معتبر ہے۔اس وقت اردو میں لکھی جانے والی نظم اور فکشن کو دنیا کے کسی بھی خطے کی بڑی شاعری اور فکشن کے مقابلے میں بآسانی پیش کیا جا سکتا ہے۔تحقیق کے لیے جن وسائل کی ضرورت ہوتی ہے اگر ان کی طرف نظر ڈالیں تو وہ ماضی سے کہیں زیادہ دستیاب ہیں۔ ماضی میں جن ماخذات کی تلاش میں محققین کو مختلف اداروں اور شہروں کی لائبیریریاں کے کئی کئی دورے کرنے پڑتے تھے ان میں سے بیشتر لائبریریوں کے مکمل ذخیرے آن لائن دستیاب ہیں۔ یہی نہیں بلکہ دنیا کے دوسرے ممالک کی لائبریریوں اور کتب تک بھی آج کے دور میں رسائی آسان ہے۔ اسی طرح جو بھی نئی کتاب چھپتی ہے وہ گھر بیٹھے منگوائی جا سکتی ہے۔ ادبی رسائل و جرائد کاغذ مہنگا ہونے اور دیگر طباعتی مسائل کی وجہ سے اب آن لائن ہو چکے ہیں۔ جامعات سے شائع ہونے والے تحقیقی مجلات بھی اپنی اپنی ویب سائٹس پر موجود ہیں۔ غور کریں تو متعلقہ مواد تلاش کرنے کے لیے بھی اب ایسے ایسے سرچ انجنز اور ٹولز دستیاب ہیں جنھوں نے محققین کا کام بہت آسان بنا دیا ہے لیکن اس کے باوجود لمحہء فکریہ ہے کہ اردو دنیا میں اس وقت جو صنف سب سے زیادہ زوال کا شکار ہے وہ تحقیق ہی ہے۔متذکرہ بالا حقائق کی روشنی میں جب ہم اس زوال کے اسباب تلاش کرنے کی کوشش کریں گے تو محققین کی لاپرواہی، خالص تحقیق میں عدم دلچسپی، تحقیق کے سندی مقاصد کے علاوہ اس میدان میں دلچسپی رکھنے والوں کو موزوں راہنمائی نہ ملنا ہی نمایاں وجوہات نظر آتی ہیں۔ لیکن ان سے ہٹ کر کچھ دیگر محرکات بھی ہیں جنھیں علمی سطح پر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تحقیق دراصل حقائق کی تلاش کا ایک عمل ہے جس کی بنیاد فلسفیانہ تجسس پر ہوتی ہے۔ فلسفیانہ تجسس گہرے مطالعے سے جڑا ہوتا ہے۔ ایک طالب علم جیسے جیسے علم حاصل کرتا جاتا ہے نئی چیزوں کے بارے میں جاننے کی اُس کی خواہش بھی بڑھتی جاتی ہے۔ ایک سوال کے جواب کی تلاش سے کئی نئے سوالات جنم لیتے ہیں اور ایک حقیقی محقق بعض اوقات اپنا اصل سوال چھوڑ کر اُن تمام جوابات کو تلاش کرتا ہے اور پھر اُن سب کو باہم جوڑ کر اپنا بنیادی مفروضہ قائم کرتا ہے۔ عہدِ حاضر میں تحقیق متذکرہ فلسفیانہ جستجو کے بجائے ترغیب کی بنیاد پر ہو رہی ہے۔ ترغیب سے یہاں مراد کوئی علمی یا معاشی ترغیب ہے۔ سند کا حصول اور پیشہ وارانہ ترقی تحقیق سے منسلک کر دی گئی ہے سو اس انسلاک کے نتیجے میں جو تحقیق کی کوالٹی سے زیادہ کوانٹٹی کو اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔اردو کے زیادہ تر محققین وہی ہیں جو اس علمی ترغیب کی بنا پر مقالات لکھ رہے ہیں۔ آزادانہ سطح پر ہونے والی تحقیق کی روایت اب دم توڑ چکی ہے۔ دوسری ترغیب معاشی مفاد ہے۔ ہائیر ایجوکیشن کمیشن اور اس جیسے مختلف اداروں سے ملنے والے ریسرچ پراجیکٹ کے نتیجے میں جو تحقیق ہو رہی ہے اسے بین الاقوامی سطح پر کوئی قبولیت ملے یا نہ ملے تاہم اس کے نتیجے میں محققین کو بڑا معاشی فائدہ ضرور حاصل ہوتا ہے۔ ریسرچ پراجیکٹ دینے والے اداروں کی نیت مثبت ہونے پر کوئی شک نہیں لیکن پراجیکٹس کی تکمیل پر اُن کے نتائج کی پرکھ اور وقعت کا اندازہ لگانے کے لیے کوئی تھرڈ پارٹی سسٹم موجود نہیں سو محقق کی پوری توجہ مختص دورانیے میں ریسرچ پراجیکٹ کی تکمیل پر ہوتی ہے نہ کہ اس کے معیاری ہونے پر۔ متذکرہ دونوں نوعیت کی تراغیب کی بدولت اب حالت یہ کہ تحقیق کے لیے موضوع سُوجھتا نہیں بلکہ گھڑا جاتا ہے۔ جہاں تحقیق کی بنیاد تفکر پر ہونی چاہیے وہاں دراصل یہ لاعلمی پر رکھی جاتی ہے۔ اُردو میں تحقیق کرنے والے طلبا ڈگری میں رجسٹریشن سے پہلے مختلف اساتذہ سے اپنے لیے موضوعِ تحقیق طلب کرتے

ہیں۔ اسی کج روی کی وجہ سے ہمارے موضوعات میں تکرار بہت زیادہ ہوتی جا رہی ہے۔ ایک ہی موضوع پر بعض اوقات مختلف جامعات میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالات لکھے جا رہے ہوتے ہیں۔ کوئی ایسا مرکزی ڈیٹا بیس کسی بھی سطح پر موجود نہیں جس میں پاکستان بھر کی جامعات میں ہونے والے مقالات نہ سہی لیکن کم از کم ان کے موضوعات ہی موجود ہوں تاکہ طالب علم کسی موضوع کے انتخاب کو فائنل کرنے سے پہلے اُس ڈیٹا بیس سے چیک کر سکے کہ آیا اس موضوع پر کہیں پہلے سے کام تو نہیں ہو چکا۔ حیران کن طور پر ہائیر ایجوکیشن کمیشن جیسی مانیٹری باڈی نے بھی اس ضمن میں اب تک کوئی قدم نہیں اٹھایا۔اُردو تحقیق کی اس ابتر حالت کا نتیجہ مستقبل قریب میں یہ نظر آ رہا ہے کہ ہماری اسناد اور زیادہ بے وقعت ہو جائیں گی۔ ایک طرف ویسے ہی پاکستان میں سوشل سائنسز کو ریسرچ فنڈنگ کرنے والے ادارے مسلسل اس بنیاد پر نظرانداز کر رہے ہیں کہ آنے والا وقت سائنس اور ٹیکنالوجی کا ہے اس لیے ہماری تمام توجہ اور سرمایہ کاری اسی میدان میں ہونے والی تحقیق پر ہونی چاہیے اور دوسری طرف سوشل سائنسز اور ہیومینٹیز کے ڈسپلنز سے متعلقہ شعبے خود بھی اپنی روش پر غور کرنے کو تیار نہیں۔تحقیق میں جستجو، تفکر اور محنت تینوں فی زمانہ مفقود ہو چکی ہیں۔

متذکرہ بالا پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے ضروری ہے کہ نئے محققین پر اُردو تحقیق کی اُس روایت کو آشکار کیا جائے جو ہمارے لیے نمونے کا درجہ رکھتی ہے۔ بیسویں اور اکیسویں صدی کے شعراء، افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کی تخلیقات کے تنقیدی مطالعات پر اسناد بانٹنے سے پہلے طلبا کو اس امر سے رُوشناس کرایا جائے کہ جیسے تنقید کے بغیر تحقیق کا کوئی وجود نہیں ہو سکتا اُسی طرح تحقیق کے بغیر تنقید بھی بامعنی نہیں بن سکتی۔ مولوی عبد الحق، مسعود حسن رضوی ادیب، حبیب الرحمٰن شروانی، حافظ محمود شیرانی،قاضی عبد الودود، محی الدین قادری زور،عبد القادر سروری، مالک رام، امتیاز علی عرشی، شیخ محمد اکرام، خواجہ احمد فاروقی، گیان چند جین، رشید حسن خان، جمیل جالبی،خلیق انجم، مشفق خواجہ اور معین الدین عقیل کے ناموں سے ہی واقفیت کافی نہیں بلکہ طلبا کو ان کی تحقیقات کا بغور جائزہ لینے کی طرف راغب کیا جائے۔ ہم نے اُردو تحقیق کی زبوں حالی کی وجوہات میں طلبا کی عدم دلچسپی اور تحقیق کے مخصوص مقاصد سے ہٹ کر خالص تحقیق کے لیے مناسب راہنمائی نہ ہونے کی جانب بھی اشارہ کیا تھا۔ یہ راہنمائی صرف مناسب موضوع کے انتخاب میں معاونت، مسودے میں اقتباس شامل کرنے کا طریقہ اور حوالے اور حاشیے کا اندراج سکھا دینے تک محدود نہیں ہونی چاہیے بلکہ اس سب سے پہلے اُردو کے جید محققین میں سے کسی ایک محقق کے اہم ترین تحقیقی کام کے گہرے مطالعے کی طرف راغب کرنے اور اسے سمجھنے میں معاونت سے بھی متعلق ہے۔ اُردو کے جس محقق نے رشید حسین خان یا گیان چند جین یا جمیل جالبی صاحب کے کسی بھی ایک تحقیقی منصوبے کا بغور مطالعہ کر لیا وہ کم ازکم یہ ضرور سمجھ جائے گا کہ تحقیق کے معانی کیا ہیں۔ جس محقق نے مولانا شبلی نعمانی کی "شعر العجم" دیکھی ہو اور اس کے بعد حافظ محمود شیرانی کی "تنقیدِ شعر العجم" کا مطالعہ کیا ہو یا رشید حسن خان کی مرتبہ "باغ و بہار"، "فسانہء عجائب"، "سحر البیان"، "گلزارِ نسیم" یا "زٹل نامہ" میں سے کسی ایک مدونہ کتاب کا مقدمہ ہی ایک دو بار بغور پڑھ لیا ہو وہ تحقیق کے میدان میں اترنے کے لیے پوری طرح تیار ہو سکتا ہے لیکن ہماری جامعات میں رائج سمسٹر سسٹم میں جہاں ہر ڈیڑھ مہینے بعد امتحان سر پر ہو وہاں طالب علم کو وقت کی کمی کا سامنا بھی خارج از بحث حقیقت نہیں۔ایسے مطالعات کے لیے وافر وقت اور فرصت کا وہ ماحول بھی ضروری

ہے جو محققین کو دستیاب نہیں، انھیں ایک مخصوص دورانیے میں اپنا تحقیقی منصوبہ مکمل کرکے جمع کرانا ہوتا ہے اور اُس مخصوص دورانیے میں اُن کے لیے اپنے موضوع کے انتخاب سے لے کر متعلقہ مواد کی جمع آوری، اُس مواد کا مطالعہ، بنیادی ماخذات کے نوٹس لینا اور مقالے کی تسوید کا عمل مکمل کرنا بھی ایک چیلنج ہے۔ بہر صورت متذکرہ بالا تمام چیلنجز کو تسلیم کرتے ہوئے بھی ہم نمونے کے طور پر چند ایسی تحقیقات کا حوالہ ضرور دینا مناسب سمجھیں گے جن کی طرف نئے محققین کو ایک نظر ضرور کرنی چاہیے۔

محمد حسین آزاد کی مشہورِ زمانہ تصنیف "آبِ حیات" کم وبیش تمام جامعات کی نصاب میں شامل ہے اور یہ تصنیف مختلف سطح کے طالب علموں کو پڑھائی بھی جاتی ہے۔ اس کتاب نے اپنی اشاعت کے بعد اُردو شاعری کے کلاسیکی عہد کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے ضمن میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔ محمد حسین آزاد ایسے عالم کی تحقیقی مساعی کے علاوہ اس کتاب میں انھوں نے اپنی انشاپردازی کے جو جوہر بکھیرے وہ آج بھی متاثر کن ہیں۔لیکن پھر کچھ جید محققین کی تفکرانہ نظر اس کتاب کے مشمولات پر پڑھی تو انھوں نے مختلف سوالات اٹھانا شروع کیے۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں جن محققین نے آزادؔ کو آڑے ہاتھوں لیا اُن میں سرفہرست حبیب الرحمن خان شروانی اور قاضی عبد الودود ہیں۔ قاضی عبد الودود کا ایک عالمانہ مقالہ "محمد حسین آزادؔ بحیثیت محقق"1942-43ء میں پٹنہ سے شائع ہوا۔ ادارہء تحقیقاتِ اُردو سے اس مقالے کی اشاعتِ ثانی 1984ء میں ہوئی۔ اس کے آغاز میں قاضی عبد الودود لکھتے ہیں:

> "اکثریت آزاد کی نثاری کی معترف ہے مگر یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ وہ تحقیق کے مردِ میدان تھے۔ اقلیت مصر ہے کہ وہ صرف ایک بڑے انشاپرداز ہی نہیں، ایک بڑے محقق بھی تھے۔ اس کتابچہ میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ حق کس کی طرف ہے۔"(1)

اس کے بعد اپنے کتابچے کے اَسی(80) صفحات میں انھوں نے "آب حیات" کی روشنی میں محمد حسین آزاد کی تحقیق کو غیر مستند ثابت کرنے کے لیے تین سو نکات قائم کیے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہر ہر نکتہ اپنے اندر محققانہ جستجو اور تفکر کے علاوہ مطالعے کی بے پناہ گہرائی لیے ہوئے ہے۔ قاضی عبد الودود (1896ء-1984ء) کا تعلق کاکو بہار سے تھا۔ وہ انگلستان سے معاشیات اور قانون کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کر چکے تھے۔ لیکن عملی زندگی میں انھوں نے اپنا ناطہ ادب اور اس میں خالص تحقیق سے جوڑا۔ مصحفیؔ اور انشاؔ سے لے لر محمد حسین آزادؔ اور مولوی عبد الحقؔ کے ادبی کارناموں پر قاضی عبد الودود کی تحقیق نے کئی ایسے سوالات کھڑے کیے جو گو اُردو دنیا کے کچھ نامیوں کی طبع پر بہت گراں گزرے لیکن انھیں جھٹلانے یا باطل ثابت کرنے کے لیے موزوں دلائل آج تک سامنے نہ آئے۔ آج کے محققین کو کم از کم "آبِ حیات" پر قائم کیے گئے تین سو نکات کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے تاکہ وہ یہ سمجھ سکیں کہ دلیل کیسے قائم کی جاتی ہے اورتحقیق میں بنیادی ماخذ اور ثانوی ماخذ کا فرق اور اہمیت کیا ہے جسے سمجھنے میں آزادؔ ایسے عالم سے بھی سہو ہوا۔ "محمد حسین آزادؔ بحیثیت محقق" میں سے چند نکات ملاحظہ کیجیے:

"3۔ولی کا "ابتدائی عہد شاید عالم گیر کا زمانہ ہوگا" الف92، ولی کا سالِ ولادت نامعلوم ہے مگر اس میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ ان کی وفات 1119ھ میں ہوئی ہے(رجوع بہ ولی گجراتی مصنفہ جناب ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی ص81)۔ عالم گیر1118ھ میں فوت ہوا ہے۔ آزادؔ کا قول صریحاً غلط ہے۔

4۔ولی کا رسالہ ء نور المعرفت تصوف میں ہے، الف 93، یہ رسالہ چند سال ہوئے طبع ہو چکا ہے اور اس کا موضوع تصوف نہیں۔

5۔دل ولی کا لے لیا دِلی نے چھین جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

الف 93 میں ہے کہ ولی "کبھی کبھی--- حافظ کی طرح بادشاہِ وقت کے نام سے ---شعر کو شان و شکوہ دیتے تھے---"ولی کی وفات 1119ھ میں ہوئی تھی تو ظاہر ہے کہ اس کے کسی شعر میں محمد شاہ کا نام نہیں آسکتا، اس لیے کہ اس کا سال جلوس1131ھ ہے ۔ شعر کا مصرع یوں ہے : "اس گدا کا دل لیا دِلی نے چھین" اور یہ مضمون کا ہے۔ (گلشنِ گفتار ص19، چمنستانِ شعرا، ص357)"(2)

مندرجہ بالا چار نکات پر غور کیجیے تو بہ خوبی اندازہ ہوگا کہ ایک محقق کسی بھی متن کی پرکھ کے دوران صرف ادبی مآخذات ہی نہیں بلکہ متن کی معاصر تحقیق و تنقید اور تاریخ کو بھی ملحوظِ خاطر رکھتا ہے اور پھر آزاد کے تمام بیانات کو کراس چیک کرکے اُن پر رائے قائم کرتا ہے۔ محمد حسین آزادؔ کی ولی دکنی کے بارے میں جن باتوں کو قاضی صاحب نے رد کیا ہے بظاہر آزادؔ نے وہ باتیں بغیر تحقیق کے اورسنی سنائی پر یقین رکھتے ہوئے "آبِ حیات" میں درج کر دیں۔ ایسی ہی ایک اور بات انھوں نے مرزا مظہر جانِ جاں کے بارے میں بھی لکھی جس پر قاضی عبد الودود نے پکڑ کی ہے، ملاحظہ کیجیے:

"سودا ؔ کا ایک قطعہ الف ص143، اور کلیات کے بعض قلمی نسخوں میں ہے، جس میں مظہر کے اشعار ریختہ کی نسبت کہا گیا ہے کہ "کتا ہے دھوبی کا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا"، آزاد لکھتے ہیں کہ "نکتہ اس میں یہ ہے کہ مرزا صاحب نے ایک دھوبن گھر میں ڈال رکھی تھی"۔ میرزا مظہر شاعر ہی نہیں صوفی بھی تھے اور بہتوں کو ان سے عقیدت تھی اور ہے ایسے شخص کے متعلق ایسی بات کسی سند کے بغیر درجِ کتاب کرنا کسی طرح لائقِ ستائش نہیں۔"(3)

یہی نہیں بلکہ قاضی عبد الودود نے یہ بھی اعتراض اٹھایا ہے کہ محمد حسین آزادؔ اُن کا نام مرزا مظہر جانِ جاناں لکھتے ہیں کہ یہ نام انھیں عالم گیر نے دیا تھا جبکہ اُن کا پیدائشی اور درست نام مظہر جانِ جاں تھا ، سو عالم گیر کا دیا نام آزادؔ ایسے عالم اور محقق کے لیے اصل اور پیدائشی نام سے زیادہ معتبر نہیں ہونا چاہیے۔ مرزا مظہر جانِ جاں کے حوالے سے آزادؔ کے ملفوظات کی پکڑ اول مولوی حبیب الرحمن خان شروانی اور دوم قاضی عبد الودود کو کسی حد تک مہنگی بھی پڑی کہ آزادؔ سے عقیدت والوں نے اِس امر کو اُن کی شیعہ مخاصمت کے زمرے میں شمار کیاواضح رہے کہ مسلکی اعتبار سے قاضی عبد الودود سنی تھے اور مرزا

مظہر جانِ جاں بھی سنی (حنفی) صوفی تھے، تاہم اُن کی حسن پرستی کے قصہ گو محمد حسین آزاد کا تعلق شیعہ مسلک سے تھا۔ اغلب ہے کہ آزادؔ کے ممدوح مسعود حسن رضوی ادیب نے اس معاملے کو زیادہ ہوا دی کہ وہ خود بھی آزادؔ کے ہی ہم مسلک تھے ، انھوں نے ہی "آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ" مطبوعہ دین دیال روڈ لکھنو ، 1953ء میں لکھا کہ :

> "مذہبی تعصب کے مریضوں کو ان بیانوں میں آزادؔ کے تعصب کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ یہ تو یاد رکھتے ہیں کہ مرزا مظہر ؔایک صوفی بزرگ تھے، لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ تصوف کے مسلک میں عشقِ مجازی عشقِ حقیقی کا زینہ سمجھا جاتا ہے ۔۔حقیقت یہ ہے کہ تصوف کے مسلک میں حسن پرستی اور عاشق مزاجی عیب نہیں ہُنر ہے ۔۔آزادؔ نے مرزا مظہر کا ذکر جس احترام سے کیا ہے اُس سے سوء ظن کی گنجائش باقی نہیں رہتی ، مگر بدنیتی اور بد گمانی کا کیا علاج۔"(4)

یہی نہیں بلکہ انھوں نے مرزا مظہر کے نام کے حوالے سے آزادؔ کے بیان پر اُٹھائے گئے اعتراضات کا جواب بھی دینے کی کوشش کی ہے اور طویل بحث کے بعد مرزا مظہر کی مشہور تصنیف "معلوماتِ مظہری" کا حوالہ دیتے ہوئے رقم طراز کہ یہ کاتبوں کا سہوِ قلم ہے کہ جانِ جان کو جانِ جاناں لکھا گیا(5)۔مسعود حسین رضوی ادیب نے اپنے سو صفحات کے کتابچے میں محمد حسین آزاد اور"آبِ حیات" کا بھرپور انداز میں دفاع پیش کیا ہے اور بہت سی غیر مستند معلومات کو بے جا بحث سے مستند بنانے کی یوں کوشش کرتے ہیں کہ آزادؔ ایسے عالم کا بطور محقق مرتبہ کم نہ ہو لیکن قاضی عبد الودود کی تحقیق اور دلائل کے سامنے اُن کا دفاع کمزور محسوس ہوتا ہے۔ پھر قاضی عبد الودود ایسے عالم پر مذہبی تعصب کا الزام بھی بے جا ہے۔ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

> " اگر ادبی تحقیق کوئی دین ہوتی تو بلاشبہ قاضی عبدالودود اس کے نبی ٹھہرائے جاتے۔ ان کا مسلک سچ اور محض سچ تھا جو کسی ذات کی پروا کیے بغیر حقیقت کو افشا کرتے رہتے تھے، جو علائق کی آلائش سے ملوث نہ ہوتے تھے۔ وہ ان ارباب تحقیق کی طرح نہ تھے جو ہندو ہیں تو نسیمؔ و چکبستؔ کی جبّہ داری ان کا دھرم ہے، جو مسلمان ہیں تو اقبالؔ کے خلاف ایک لفظ سننے کو تیار نہیں ، جو شیعہ ہیں تو محمد حسین آزادؔ کا دفاع کرنا ان کا مذہبی فریضہ ہے۔ قاضی صاحب کو صرف اس سے سروکار تھا کہ کیا لکھا ہے، اس سے کچھ لینا دینا نہ تھا کہ لکھنے والے کا فرقہ، گروہ یا مرتبہ کیا تھا۔قاضی عبدالودود نے اردو تحقیق کو ایک جہت دی، ایک معیار عطا کیا۔"(6)

اُردو کے میدانِ تحقیق کے نووارداں کو اپنے سامنے جن معیاراتِ تحقیق کو رکھنا چاہیے اُن کی ایک مثال قاضی عبد الودود ہیں۔ مختلف نقادوں کی طرح مختلف محققین بھی ایک دوسرے کی تحقیقات کا جائزہ لیتے رہتے تھے اور اُن پر جہاں کہیں کوئی جھول دکھائی دیتا تو سوال بھی اٹھاتے۔ قاضی عبد الودود کا اختصاص یہ ہے کہ وہ کسی کے مقام و مرتبے سے مرعوب ہوئے بغیر اور اس سے تعلقِ خاطر سے قطع نظر ہمیشہ درست اور صحیح بات سامنے لانے کی

کوشش کرتے۔ مسعود حسین رضوی ادیب نے قاضی عبد الودود کی تحقیقات پر سوالات اٹھانے کی کوشش کی تو قاضی عبد الودود نے اُن کے مرتبہ "دیوانِ فائز" کو اٹھایا اور دلائل کے ساتھ مسعود حسین رضوی ادیب کے اس دعوے کو باطل قرار دیا کہ ولیؔ نے فائز کی زمین میں غزلیں کہیں یا وہ فائز کے ہم عصر تھے۔ بلکہ انھوں نے فائزؔ کو ولیؔ کا مقلد قرار دیا۔(7) اسی طرح خواجہ احمد فاروقی ایسے عالم جن کا کام آج بھی میر تقی میر کے حوالے سے سند کا درجہ رکھتا ہے، کی کتاب "میر تقی میر: حیات اور شاعری" میں درج اس بیان کو دلائل کے ساتھ غلط قرار دیا کیا کہ "نکات الشعراء" میں ایک سو ساٹھ شاعروں کا تذکرہ ہے، قاضی عبد الودود نے واضح کیا کہ یہ ایک سو تین شعراء کے تذکرے کو محیط ہے(8)۔ قاضی عبد الودود صاحب نے اُردو تحقیق کا وہ معیار طے کر دیا کہ جس کو پہنچنا غالباً آج کے نئے محققین کے لیے بہت مشکل ہے لیکن بہرکیف اس معیار کو ذہن میں رکھ کر میدانِ تحقیق میں قدم رکھا جا سکتا ہے۔ یہ تو آج سے کم و بیش پون صدی پیچھے کی تحقیقات اور اُن کے معیارات کی مثالیں تھیں۔ ہمارے معاصرین میں بھی کچھ ایسے محققین نظر آتے ہیں جنھوں نے واقعتاً متذکرہ معیاراتِ تحقیق کو ذہن میں رکھتے ہوئے کام کیا ہے۔ ملتان سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر ابرار عبد السلام جو آج کل ایمرسن یونیورسٹی ملتان میں صدر شعبہ اردو ہیں، انھوں نے ڈاکٹر گیان چند جین اور ڈاکٹر سیدہ جعفر کی مولفہ "تاریخِ ادب اُردو:1700ءتک" (پانچ جلدوں میں)، مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان ، دہلی پر ایک تحقیقی لکھا جو دسمبر 2006ء میں بہاء الدین زکریایونیورسٹی ملتان کے "جرنل آف ریسرچ" میں شائع ہوا۔ یہ مقالہ بالکل اُسی طرز پر نکات قائم کرکے تحریر کیا گیا ہے جیسے قاضی عبد الودود نے محمد حسین آزاد کی "آبِ حیات" پر لکھا ۔ ڈاکٹر ابرار عبد السلام بحیثیت محقق ان دونوں شخصیات سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں کیونکہ متذکرہ مقالے کی تسوید سے پہلے انھوں نے "آبِ حیات" کا حواشی و تعلیقات کے ساتھ تدوین بھی کی اور یہ کتاب شعبہ اردو بہاء الدین زکریایونیورسٹی ملتان سے شائع ہوچکی ہے۔ ڈاکٹر ابرار عبد السلام کا متذکرہ مقالہ بھی اب الگ کتاب کی صورت میں چھپ چکا ہے۔ اس مقالے میں انھوں نے کل 361 نکات قائم کیے ہیں جن میں گیان چند جین اور سیدہ جعفر کی "تاریخِ ادب اُردو: 1700ء تک" کی ایسی ایسی اغلاط کی نشاندہی کی گئی ہے جن کی روشنی میں یہ تاریخِ ادب بالکل اُسی طرح استناد کے درجے سے گر جاتی ہے جیسے قاضی عبد الودود صاحب کے مقالے کی روشنی میں آزادؔ کی "آبِ حیات"۔اس مقالے سے چند نکات ملاحظہ کیجیے:

> "جب728ھ/1327ء میں محمد تغلق نے دہلی کی بجائے دولت آباد (دیوگیری) کو اپنا پایہ تخت بنایا تو لوگ جوق در جوق جنوب کی سمت منتقل ہونے لگے ۔(جلد اول، ص120)

> مذکورہ بالا بیان میں تین باتین تشریح طلب ہیں۔(1) 728ھ، 28-1327ء کے مطابق ہے۔ 728ھ میں دو مہینے 1327ء اور دس مہینے 1328ء کے پڑتے ہیں۔مذکورہ بیان میں ہجری سنہ کو بنیاد بنایا گیا ہے اور یہ نہیں بتایا گیا کہ کس مہینے میں دارالحکومت کی منتقلی عمل میں آئی۔ اگر ہجری سن کے اول دو مہینوں میں یہ عمل رونما ہوا تھا تو سال عیسوی درست قرار پاتا ہے۔ بصورتِ دیگر 1328ء درست ہوگا۔(2)رحم علی الہاشمی نے جرنل آف ایشیاٹک

سوسائٹی اور مسالک الابسار کے حوالے سے نشاندہی کی ہے کہ دیو گیر کا نام پہلے دولت آباد نہیں بلکہ قبۃ الاسلام رکھا گیا۔ اور دارالضرب کا یہی نام سکوں پر درج ہے(حاشیہ: دکن کے بہمنی سلاطین، ص38)رحم علی الہاشمی نے ڈاکٹر مہدی حسن کی تصنیف "دی رائیز اینڈ فال آف محمد بن تغلق" مطبوعہ لندن کے حوالے سے یہ نشاندہی کی ہے کہ دارالسلطنت پورے طور پر دہلی سے دولت آباد منتقل نہیں کیا گیا تھا۔دہلی اور دور دراز کے صوبہ جات دکھن میں جو طویل فاصلہ تھا اس کے پیش نظر صرف مسلم آبادی کے عماید کو دہلی سے منتقل کیا گیا تھا۔ اس لیے دولت آباد کو سلطنت کا دوسرا مستقر کہا جا سکتا ہے۔(حاشیہ دکن کے بہمنی سلاطین، ص37)۔۔تاریخ منظوم سلاطینِ بہمنیہ ص11 میں دارالسلطنت کا نام دیوگیری کی بجائے دیوگیر مرقوم ہے۔"(9)

مندرجہ بالا اقتباس میں محقق ڈاکٹر ابرار عبد السلام نے تاریخ ہندوستان اور بالخصوص تاریخِ اُردو ادب کے اہم ترین واقعے شہنشاہ محمد تغلق کے دارالسلطنت کی شمال سے جنوب منتقلی کے بیان پر مختلف اہم ماخذات کی روشنی میں گیان چند جین اور سیدہ جعفر کی کوتاہیوں کی نشاندہی کی ہے۔ متذکرہ مورخین کے بعد بھی اُردو کے جن ادبی مورخین نے تواریخ لکھیں اُن میں اسی بیان کو تسلسل سے دہرایا گیا کہ محمد تغلق کے زمانے میں دہلی پورے کا پورا دکھن منتقل ہوگیا تھا، کچھ معتبر مورخین نے تو یہاں تک لکھ رکھا ہے کہ دہلی میں انسان تو کیا کوئی جانور بھی نظر نہ آتا تھا اور سب کے سب اپنے مال و اسباب کے ہمراہ دہلی سے دکھن منتقل ہو گئے اور وہاں ایک نیا شہر آباد ہو گیا لیکن ڈاکٹر ابرار عبد السلام کی تحقیق نے اس بیان کو باطل ثابت کیا ہے۔ اسی طرح دولت آباد کا پرانا نام دیوگیر کے بجائے اکثر مورخین نے دیوگیری لکھا ہے، بلکہ اُردو کی کسی بھی نمایاں ادبی تاریخ میں اس شہر کے پہلے مجوزہ نام "قبۃ الاسلام" کا ذکر بھی نہیں ملتا۔ ڈاکٹر ابرار عبد السلام کے معیارِ تحقیق کے ملاحظے کے لیے چند اور مثالیں دیکھیے:

"89۔باغِ لنگم پلی عبد اللہ قطب شاہ نے تین لاکھ روپے کے مصارف سے تیار کروایا تھا۔ (اول ص 323)۔

یہ باغ عبداللہ قطب شاہ نے نہیں بلکہ محمد قلی قطب شاہ نے تعمیر کروایا تھا۔ عبد اللہ قطب شاہ نے بطور تفریح گاہ کے اس کی تعمیر و آرائش پر تین لاکھ روپے صرف کیے تھے۔ باغ کی تعمیرِ جدید نواب سکندر جاہ بہادر مغفرت منزل نے کروائی تھی۔ 1278ھ میں نواب افضل الدولہ بہادر غفران منزل نے یہ باغ نواب سر خورشید جاہ بہادر کو دے دیا تھا۔ (دیکھیے: مآثر دکن، ص18-19)"(10)

"93۔ اورنگزیب نے کہا تھا کہ قطب شاہی فوج میں چند اور لاری ہوتے تو قلعہ گولکنڈہ کبھی فتح نہیں کیا جاسکتا تھا۔(اول ص365)

اورنگزیب نے صرف یہ کہا تھا کہ اگر ابوالحسن کے پاس عبد الرزاق لاری جیسا ایک اور آدمی ہوتا تو شاید قلعہ کی تسخیر میں اتنا ہی عرصہ لگ جاتا۔(دیکھیے: منتخب اللباب ، حصہ سوم، ص327، سیر المتاخرین، جلد اول، ص 369)"(11)

"112۔جب اکبر نے جہانگیر کی شادی راجہ بھگوان داس کی لڑکی سے کی۔(اول ص442)

عبد الغنی نے اپنی تصنیف"اے ہسٹری آف پرشین لینگوئج اینڈ لٹریچرایٹ دی مغل کورٹ" میں ص31 میں راجہ کا نام "بھگونت داس" لکھا ہے۔ حامد حسن قادری سے پڑھنے میں غلطی ہوئی ۔ اسی غلطی کو ڈاکٹر صاحب نے دہرا دیاہے۔ راجہ بھگوان داس علیحدہ شخصیت ہیں۔ دیکھیے: "اے ہسٹری آف پرشین لینگوئج اینڈ لٹریچر ایٹ دی مغل کورٹ، جلد سوم، ص474)"(12)

اُردو کے تحقیق کے متذکرہ بالا نمونوں میں جن اعلیٰ معیارات کو قائم رکھا گیا ہے وہ دراصل دیگر اصنافِ ادب کی طرح تحقیق کے بھی کلاسیکی عہد کی یادگار ہیں جب محققین کے لیے ایک بڑا موضوع تاریخِ ادبِ اُردو تھا۔ اُس دور میں محققین کی زیادہ توجہ شخصیات کے درست کوائف اور ان سے منسوب معلومات کی درست تسوید کی طرف رہی، اس کے بعد دوسرا اہم ترین موضوع اُردو زبان کے آغاز و ارتقا رہا جس پر بہت سے جید محققین نے قلم اٹھایا ۔ان دونوں طرح کے موضوعات پر ہونے والی تحقیقات پر بعد کے محققین نے نئے دستیاب مآخذات اور مواد کی روشنی میں اعتراضات اٹھائے جس کی ایک مثال متذکرہ بالا ڈاکٹر ابرار عبد السلام کا مضمون ہے۔اس کے بعد اُردو تحقیق کا سفر سندی تحقیق کے دور میں داخل ہوا اور اس میں مختلف اصناف کی تخلیقات کے تجزیاتی اور تقابلی مطالعات زیادہ سامنے آئے۔عصرِ حاضر تک آتے آتے تحقیق مختلف تنقیدی رجحانات، تھیوریز اور تحریکات کی روشنی میں متون کی تفہیم کے دائرے میں داخل ہو گئی۔تحقیق کے اس سفر میں دیکھا جائے تو موضوع کا انتخاب ہمیشہ اہم ترین سرگرمی رہی اور جید محققین نے بھی مناسب موضوع کے انتخاب کو کام کی نصف تکمیل قرار دیا۔ لیکن مسئلہ یہ ہوا کہ تحقیق کے طریقِ کار کی طرف توجہ کم ہو گئی۔ معاصر عہد کے نووارداںِ میدانِ تحقیق کے لیے سب سے اہم معاملہ مواد کی دستیابی اور جمع آوری کا ہوتا ہے، عموماً وہ دیکھ کر موضوع فائنل کرتے ہیں کہ اس پر مواد کس حد تک دستیاب ہو سکے گا۔ اس رویے نے تحقیق کے معیار کو بری طرح متاثر کیا ہے اور اب حالت یہ ہے کہ ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر تحقیقات کرنے والے عموماً اپنے مقالات میں اقتباسات پہلے بٹھاتے ہیں اور ان پر کمنٹری بعد میں کرتے ہیں اور لیجیے مقالہ تیار ہو گیا۔ تحقیقی مقالات لکھنے والے طلبا کی بڑی تعداد وہ ہے جن کے ذہن میں مقالے کے موضوع اور تحقیقی اُصولوں سے زیادہ ہمہ وقت ڈگری کی تکمیل پر حکومت کی جانب سے ملنے والا الاؤنس یا انسنٹو ہوتا ہے۔ اب تو شنید ہے کہ مقالات لکھنے کا کام بھاڑے پر بھی کیا جا رہا ہے۔ اس صورتحال میں آپ اُردو تحقیق کے زوال اور محققین کی زوال آمادگی کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ہماری نظر میں یہاں پھر ایک دفعہ اداروں اور پالیسی ساز انتظامیہ سےکہیں زیادہ ذمہ داری اُس سپروائزر یا اُستاد پر آتی ہے جس کی نگرانی میں تحقیق کی جارہی ہو۔ اگر اساتذہ اپنے طلبا کے

سامنے کورس ورک کے دوران اور اسائنمنٹس کے ذریعے اس مضمون میں متذکرہ بالا قاضی عبد الودود اور ڈاکٹر ابرار عبدالسلام کے لکھے ہوئے مقالات رکھیں اور بتائیں کہ تحقیق کے اصل معانی سمجھیے اور ان علما ء کی تحقیقات کو توجہ سے پڑھیے اور ان کی روشنی میں اپنے اذہان کو تحقیق کے لیے تیار کیجیے تو یقیناً معیاری تحقیق کے سو فیصد نہ سہی تو پچاس فیصد نمونے تو سامنے آ سکتے ہیں۔اداروں کی سطح پر علمی نثر لکھنے اور تحقیقی اسلوب سمجھانے کے لیے مناسب ورکشاپس کا وقتاً فوقتاً انعقاد بھی اس ضمن میں معاون سرگرمی ثابت ہو سکتی ہے۔ تحقیق کے بارے میں یہ بات واضح کر دینی چاہیے کہ یہ دراصل کوئی علم نہیں بلکہ مہارت ہے جس کو بنیادی توانائی علم سے ملتی ہے، علم خود سے کتابیں اور مضامین اور متعلقہ مواد پڑھ کر حاصل ہو سکتا ہے لیکن مہارت کہیں سے حاصل کرنا پڑتی ہے۔

حوالہ جات:

1- قاضی عبد الودود، محمد حسین آزاد بحیثیت محقق، (پٹنہ: ادارہ تحقیقاتِ اُردو،1984ء)،ص1

2- ایضاً،ص1-2

3- ایضاً،ص4

4- مسعود حسن رضوی ادیب، آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ، دین دیال روڈ، لکھنو، 1953، ص29-33

5- ملاحظہ کیجیے: ایضاً، ص55

6- گیان چند جین، قاضی عبد الودود اور تنقیدِ آبِ حیات، مشمولہ: یادگار نامہ قاضی عبد الودود، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 2000ء، ص96

7- ملاحظہ کیجیے: عیارستان، از:قاضی عبد الودود، مطبع لیبل لیتھو پریس، پٹنہ، 1957ء، ص 7

8- ایضاً، ص 28

9- ابرار عبد السلام،تاریخ ادبِ اردو--1700ء تک: تحقیق کے آئینے میں،مشمولہ: جرنل آف ریسرچ،، شمارہ نمبر10، بہاء الدین زکریایونیورسٹی، ملتان، 2010ء، ص251-252

10- ایضاً، ص276

11- ایضاً، ص277

12- ایضاً، ص284